Al-Mīthāq ***(Research Journal of Islamic Theology)***
ISSN: 2791-0989 (P), 2791-0997 (E)
Volume 05, **Issue** 02, April - June 2026, **PP**: 286-307
Open Access at: https://almithaqjournal.org/

Article QR

سیرتِ نبوی ﷺ کی قرآنی تشکیل اور تفسیری تعبیرات: اردو تفاسیر کی روشنی میں فقہ السیرۃ کا تجزیاتی مطالعہ

The Qur'ānic Formation of the Prophetic Sīrah and Its Interpretive Expressions: An Analytical Study of Fiqh al-Sīrah in the Light of Urdu Tafāsīr

1. Almas Ilyas almasilyas333@gmail.com	*MPhil Scholar, DIS, Riphah International University Faisalabad.*
2. Dr. Faizan Hassan Javed engr.faizan@riphahfsd.edu.pk	*Assistant Professor, DIS, Riphah International University Faisalabad.*

How to Cite:	Almas Ilyas and Dr. Faizan Hassan Javed. 2026: "The Qur'ānic Formation of the Prophetic Sīrah and Its Interpretive Expressions: An Analytical Study of Fiqh al-Sīrah in the Light of Urdu Tafāsīr". Al-*Mīthāq (Research Journal of Islamic Theology)* 5 (02): 286-307.
Article History:	**Received**: 19-05-2026 / **Accepted**: 13-06-2026 / **Published**: 30-06-2026
Copyright:	**©The Authors**
Licensing:	This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.
Conflict of Interest:	Author(s) declared no conflict of interest.

Abstract & Indexing

Publisher

HIRA INSTITUTE
of Social Sciences Research & Development

سیرتِ نبوی ﷺ کی قرآنی تشکیل اور تفسیری تعبیرات: اردو تفاسیر کی روشنی میں فقہ السیرۃ کا تجزیاتی مطالعہ

The Qur'ānic Formation of the Prophetic Sīrah and Its Interpretive Expressions: An Analytical Study of Fiqh al-Sīrah in the Light of Urdu Tafāsīr

1. **Almas Ilyas**
   MPhil Scholar, DIS, Riphah International University Faisalabad.
   almasilyas333@gmail.com

2. **Dr. Faizan Hassan Javed**
   Assistant Professor, DIS, Riphah International University Faisalabad.
   engr.faizan@riphahfsd.edu.pk

Abstract

The Qur'ān presents the life and conduct of the Prophet Muhammad ﷺ as a living model of guidance rather than merely a record of historical events. Its diverse accounts of his mission, character, worship, conduct, social relations, leadership, patience, struggle, justice, and dealings with individuals and communities provide essential foundations for understanding the Sīrah as a source of guidance. This study examines these Qur'ānic dimensions of the Prophetic Sīrah and investigates how they have been interpreted and developed within Urdu exegetical literature from the perspective of Fiqh al-Sīrah. It begins by clarifying the concept of Fiqh al-Sīrah and identifying the major Qur'ānic themes through which the Prophetic model is articulated. It then examines the treatment of these themes in Urdu Tafāsīr, focusing on their ethical, spiritual, legal, social, educational, reformative, and practical dimensions. The analysis demonstrates that the Qur'ānic portrayal of the Prophetic Sīrah extends beyond the narration of individual events, it establishes principles for moral character, spiritual development, interpersonal conduct, social responsibility, justice, leadership, and practical engagement with the challenges of life. Urdu exegetes further illuminate these dimensions by connecting Qur'ānic guidance with the Prophetic response to diverse personal and collective circumstances. The study concludes that an integrated reading of the Qur'ān and its Urdu exegetical interpretations reveals Fiqh al-Sīrah as a comprehensive framework for understanding Prophetic guidance and translating its principles into individual and collective life.

Keywords: *Fiqh al-Sīrah, Qur'ānic Perspectives, Urdu Tafāsīr, Prophetic Guidance, Sīrah Interpretation, Qur'ānic Exegesis.*

تعارفِ موضوع

سیرتِ نبوی ﷺ اسلامی زندگی کا وہ عملی نمونہ ہے جس میں قرآن مجید کی تعلیمات انسانی کردار اور عمل کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو محض تاریخی واقعات کے طور پر بیان نہیں کیا، بلکہ آپ ﷺ کی دعوت، عبادت، اخلاق، صبر و استقامت، معاشرت، قیادت، عدل، انسانی تعلقات اور مختلف حالات میں اختیار کیے گئے طرزِ عمل کے ذریعے ایک ایسی عملی رہنمائی فراہم کی ہے جس سے فرد اور معاشرہ دونوں اپنی زندگی کے لیے اصول اخذ کر سکتے ہیں۔ اسی لیے سیرتِ نبوی ﷺ کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کا مطالعہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے متعلق آیات مختلف مواقع اور حالات کے حوالے سے نازل ہوئی ہیں۔ کہیں آپ ﷺ کی دعوتی جدوجہد اور مخالفین کے رویّوں کا ذکر ہے، کہیں صبر و استقامت اور اللہ پر توکل کی تعلیم ملتی ہے، کہیں آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کو نمایاں کیا گیا ہے، اور کہیں گھریلو، معاشرتی،

اجتماعی اور ریاستی معاملات میں آپ ﷺ کے طرزِ عمل کی رہنمائی سامنے آتی ہے۔ ان آیات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ قرآن میں سیرتِ نبوی ﷺ کا بیان کسی ایک پہلو تک محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی کے متعدد اہم دائروں کو محیط ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فقہ السیرۃ کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔ سیرت کے واقعات کو جان لینا ایک مرحلہ ہے، لیکن ان واقعات سے حاصل ہونے والی حکمت، رہنمائی اور عملی اصولوں کو سمجھنا اس سے آگے کی ضرورت ہے۔ فقہ السیرۃ دراصل سیرت کے واقعات اور نبوی طرزِ عمل کے پس منظر، مقاصد، حکمتوں اور عملی رہنمائی کو سمجھنے کی کوشش ہے، تاکہ سیرت محض ماضی کا مطالعہ نہ رہے بلکہ زندگی کی تشکیل کا ذریعہ بنے۔ قرآن مجید میں سیرتِ نبوی ﷺ کے بیان کو اس زاویے سے دیکھنے سے سیرت کے فکری، اخلاقی، روحانی، فقہی، معاشرتی، تربیتی اور عملی پہلو ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ مزید یہ کہ اردو تفاسیر نے ان قرآنی مباحث کی تشریح کرتے ہوئے سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اپنے علمی منہج کے مطابق واضح کیا ہے۔ مفسرین نے قرآنی آیات کے پس منظر، سیرتی واقعات اور ان سے حاصل ہونے والی اخلاقی، فقہی، معاشرتی اور عملی رہنمائی کو بیان کر کے سیرت فہمی کے دائرے کو وسعت دی ہے۔

قرآن مجید سیرتِ نبوی ﷺ کو جس انداز سے پیش کرتا ہے، اس میں محض واقعات کی تفصیل نہیں بلکہ ان واقعات کے اندر موجود ہدایت، حکمت اور عملی رہنمائی بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اردو تفاسیر نے انہی قرآنی اشارات کو کھول کر ان کے پس منظر، مقاصد اور عملی پہلو واضح کیے ہیں، جس سے سیرت کے وہ کئی گوشے سامنے آتے ہیں جو محض واقعات کے بیان سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے۔ چنانچہ قرآن کے سیرتی بیان اور اردو تفاسیر کی تشریحات کو فقہ السیرۃ کے زاویے سے پڑھنے سے سیرتِ نبوی ﷺ صرف ماضی کے واقعات کا مجموعہ نہیں رہتی، بلکہ اس کے اندر موجود فکری بصیرت، اخلاقی تربیت، عملی رہنمائی اور معاشرتی اصلاح کے اصول بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ یہی جامع فہم فقہ السیرۃ کو محض سیرت کے واقعات جاننے سے آگے لے جاتا ہے اور نبوی اسوہ کو زندگی کے مختلف معاملات میں سمجھنے اور برتنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

سابقہ کام کا جائزہ

سیرتِ نبوی ﷺ پر قدیم و جدید دور میں مختلف زاویوں سے وسیع علمی کام ہوا ہے۔ محدثین، سیرت نگاروں، فقہاء اور مفسرین نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اپنے علمی منہج کے مطابق محفوظ اور واضح کیا۔ تاہم سیرت کے مطالعے میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ بعض کتب میں واقعاتِ سیرت کو بنیادی موضوع بنایا گیا، بعض میں احادیث اور روایات کی صحت و تشریح پر توجہ دی گئی، جبکہ فقہی اور اخلاقی کتب میں نبوی طرزِ عمل سے احکام، آداب اور تربیتی اصول اخذ کیے گئے۔ اس وسیع علمی ذخیرے نے سیرت فہمی کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کی، لیکن قرآن مجید میں سیرتِ نبوی ﷺ کے منتشر بیان کو ایک مربوط فقہ السیرۃ کے زاویے سے دیکھنے کی ضرورت اپنی جگہ باقی رہی۔ قدیم علمی روایت میں امام غزالی کی احیاء علوم الدین، امام نووی کی شرح صحیح مسلم، ابن تیمیہ کی مجموع الفتاویٰ اور ابن قیم کی تحفۃ المودود جیسی کتب میں نبوی اسوہ سے متعلق اخلاقی، عباداتی، تربیتی اور فقہی رہنمائی کے متعدد پہلو ملتے ہیں۔ ان تصانیف کی اہمیت اس بات میں ہے کہ انہوں نے سیرت کے واقعات کو محض نقل نہیں کیا بلکہ ان سے دینی بصیرت، اخلاقی اصلاح اور عملی رہنمائی کے پہلو بھی واضح کیے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ میں شریعت کے احکام، انسانی مصالح اور نبوی تشریع کے مقاصد کو جس حکیمانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے، وہ سیرت کے واقعات کو ان کے مقاصد اور حکمتوں کے ساتھ سمجھنے کے لیے اہم علمی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

سابقہ کام میں سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں، قرآن مجید کی آیاتِ سیرت اور اردو تفاسیر میں ان کی تشریحات پر قابلِ قدر مواد موجود ہے، تاہم ان سب کو فقہ السیرۃ کے ایک مربوط زاویے سے ساتھ رکھ کر دیکھنے کی گنجائش موجود ہے۔ خصوصاً یہ دیکھنا اہم ہے کہ قرآن مجید میں سیرتِ نبوی ﷺ کے فکری و عملی پہلو کس انداز سے بیان ہوئے ہیں اور اردو مفسرین نے ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے ان سے کس نوع کی اخلاقی، روحانی، فقہی، معاشرتی اور عملی رہنمائی اخذ کی ہے۔ یہ مقالہ اسی تحقیقی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن میں سیرتِ نبوی ﷺ کے بیان اور اردو تفاسیر میں اس کی تشریحات کو فقہ السیرۃ کے زاویے سے مربوط کرتا ہے، تاکہ سیرت کے واقعات کے ساتھ ان سے حاصل ہونے والی حکمت، مقصد اور عملی رہنمائی بھی واضح ہو سکے۔

فقہ السیرۃ کا لغوی مفہوم

فقہ السیرۃ دو الفاظ کا مرکب ہے۔ فقہ اور سیرۃ۔

- **لغت میں فقہ کا معنی:** فقہ کا مادہ ف ق ہ ہے۔ یہ ثلاثی مجرد فعل ہے۔ فَقِهَ يَفْقَهُ فِقْهًا۔ جس کا معنی ہے گہری سمجھ۔ ابن الاثیر اپنی مشہور کتاب "النہایۃ" میں فقہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الفقه في الأصل: الفهم، يقال: فقِه الرجل بالكسر يفقِه فقهاً إذا فهم وعلم، وفقُه بالضم يفقُه: إذا صار فقيهاً عالماً[1]

فقہ کا اصل لغوی معنی سمجھنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "فقِه الرجل" (قاف کے نیچے زیر کے ساتھ) اس وقت بولتے ہیں جب کسی نے کوئی بات سمجھ لی یا جان لی ہو۔ جبکہ "فقُه" (قاف پر پیش کے ساتھ) اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص علم و فہم میں مہارت حاصل کر کے باقاعدہ فقیہ اور عالم بن جائے۔

- **فقہ کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:**

العلم بالأحكام الشرعيّة العمليّة عن أدلّتها التفصيليّة لتحصيل السعادة الأخرويّة[2]

ایسے شرعی احکامِ عمل (جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ) کا علم حاصل کرنا جو تفصیلی دلائل (قرآن وسنت) سے ثابت ہوں، تاکہ اس کے ذریعے آخرت کی سعادت (کامیابی) حاصل کی جا سکے۔

- **لغت میں السیرۃ کا معنی:** السیرۃ کا مادہ س ی ر ہے۔ یہ ثلاثی مجرد فعل ہے۔ سَارَ۔ يَسِيْرُ۔ سَيْرًا اس کا معنی ہے طریقہ، طرزِ عمل (سلوک) اور منہج (راستہ)۔[3]

- **سیرۃ کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:**

ما أضيف إلى النبي ﷺ من قول أو فعل أو تقرير أو صفة خلقية أو خلقية قبل البعثة أو بعدها[4]

رسول ﷺ کی طرف منسوب ہر قول، فعل، تقریر یا آپ ﷺ کی جسمانی اور اخلاقی صفت، جو نبوت سے پہلے کی ہو یا بعد کی۔

- دونوں الفاظ کی انفرادی تعریفات جاننے کے بعد فقہ السیرہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے:

هو فهم سيرة النبي صلى الله عليه وسلم فهما استيعابياً تفاعلياً منتجاً[5]

نبی کریم ﷺ کی سیرت کا ایسا فہم حاصل کرنا جو مکمل احاطہ کرنے والا، متحرک اور ثمر آور ہو۔

قرآن مجید میں سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف پہلو

قرآن مجید صرف احکام و اوامر کا مجموعہ نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا فکری و عملی عکس ہے۔ سیرتِ مطہرہ کا

ہر پہلو قرآن کی بنیادی نصوص اور اس کی تعلیمات سے جڑا ہوا ہے، جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کو واضح اور روشن اصول فراہم کرتا ہے۔ قرآن کے انھی ارشادات وہدایات سے اخذ ہونے والے چند اہم اور کلیدی سیرتی پہلو درج ذیل ہیں:

اوّل: دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی

اللہ رب العزت نے فرمایا:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ[6]

اے ایمان والو! جب تمہارا مقابلہ کسی دشمن کی فوج سے ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

جنگی حکمتِ عملی میں ثابت قدمی ایک بنیادی رکن ہے۔ میدانِ جنگ سے فرار شرعاً بھی جرم ہے اور عسکری اعتبار سے بھی شکست کا پیش خیمہ ہے۔ مجاہدین کی صرف جسمانی تربیت کافی نہیں بلکہ ان کی روحانی تربیت بھی ضروری ہے تاکہ وہ دشمن کے رعب میں نہ آئیں۔ نبی ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کے حوصلے بلند فرماتے تھے تاکہ وہ بڑی سے بڑی فوج کے سامنے ڈٹ جائیں۔ دوسری طرف آیت میں حکم دیا گیا کہ عین لڑائی کے وقت اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ عام طور پر انسان خوف یا جوش میں اللہ کو بھول جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے ہر کٹھن موڑ پر دعا اور ذکر کا سہارا لیا۔ آیت کے آخر میں "لعلکم تفلحون" کہا گیا۔ سیرت کی روشنی میں فلاح سے مراد صرف دشمن کو شکست دینا نہیں بلکہ اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ ایک مجاہد کا مقصد محض زمین فتح کرنا نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ثابت قدمی اور ذکر اللہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ سیرتِ مطہرہ کا اصول یہی ہے کہ پہلے تمام مادی اسباب (یعنی کہ صف بندی، اسلحہ، جاسوسی) مکمل کیے جائیں اور پھر اللہ کی مدد پر بھروسہ کیا جائے۔

دوم: نظم وضبط اور اطاعتِ امیر کی اہمیت

اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ[7]

اور بے شک اللہ نے تمہارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ سچا کر دکھایا جب تم اس کے حکم سے دشمنوں کو قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم تھک گئے اور آپس کے امور میں اختلاف کرنے لگے اور (نبی ﷺ کے) حکم کے بعد نافرمانی کرنے لگے جبکہ اللہ نے تمہیں وہ (فتح) دکھا دی جو تم پسند کرتے تھے۔ تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے بعض آخرت کے طالب تھے پھر اللہ نے تمہیں ان سے (دشمن سے) پھیر دیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے اور اللہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور اللہ مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

نبی ﷺ نے غزوہ احد میں تیر اندازوں کو ایک خاص جگہ پر قیام کا حکم دیا تھا لیکن ان کی اکثریت نے اس حکم کی تاویل کی اور جگہ چھوڑ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگی حالات میں امیر کے واضح حکم کی خلاف ورزی، چاہے وہ نیک نیتی (یعنی اجتہادی غلطی) پر مبنی کیوں نہ ہو پوری جماعت کے لیے شکست یا نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ دوسرا یہ کہ میدانِ جہاد ہو یا دعوت کا کام جب تک نیت خالص رہتی ہے اللہ کی نصرت شاملِ حال رہتی ہے۔ جوں ہی مادی مفادات (مالِ غنیمت وغیرہ) کی تڑپ پیدا ہوتی ہے روحانی قوت

کمزور پڑ جاتی ہے اور غیبی مدد رک جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شروع میں تم کامیاب ہو رہے تھے لیکن پھر تم نے بزدلی دکھائی اور جھگڑا کیا۔ لہٰذا باہمی اختلاف اور تنازعہ کسی بھی مشن کی ناکامی کا بنیادی سبب ہے۔ دوسری طرف یہ آیت قائدین کو یہ سبق دیتی ہے کہ اگر ماتحتوں سے نادانی میں کوئی بڑی غلطی ہو جائے اور وہ تائب ہوں تو ان کے خلاف تادیبی کاروائی کی بجائے عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے تاکہ ان کا تعلق جماعت سے ٹوٹ نہ جائے۔ یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ کامیابی کا دارومدار صرف مادی اسباب پر نہیں بلکہ اطاعتِ رسول ﷺ، باہمی اتحاد اور نیت کے اخلاص پر ہے۔

سوم: افواہ سازی کی ممانعت اور اصولِ تفویض

اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ اِلَّا قَلِيْلًا[8]

جب ان لوگوں کے پاس امن یا خوف سے متعلق کوئی خبر آتی ہے تو وہ فوراً اسے پھیلا دیتے ہیں حالانکہ اگر وہ ایسی خبر رسول ﷺ اور اپنے ذمہ دار اہلِ اختیار تک پہنچا دیتے تو جو لوگ بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے چل پڑتے۔

سیرتِ طیبہ کا یہ اصول ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے پھیلانا مناسب نہیں۔ جنگی حالات ہوں یا امن کے، حساس معلومات کی اشاعت سے پہلے ان کی حقیقت کا جاننا ضروری ہے۔ معاملات کو اللہ کے رسول ﷺ اور اولو الامر (یعنی حکام یا علما) کی طرف لوٹانا واجب ہے۔ نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو یہ تربیت دی تھی کہ وہ انفرادی طور پر فیصلے کرنے کی بجائے قیادت سے رجوع کریں کیونکہ اسی سے نظمِ جماعت قائم ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہر شخص ہر خبر یا مسئلے کا تجزیہ کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ پیچیدہ مسائل (جیسا کہ سیاسی، جنگی یا فقہی) کو ان کے ماہرین کے سپرد کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ اہم معاملات میں ماہر صحابہ رضوا ن اللہ اجمعین سے مشورہ فرماتے تھے۔ اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ صاحبِ رائے کی بات کو عام آدمی کی رائے پر فوقیت حاصل ہے۔ اس آیت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر وہ خبر جس کا تعلق قوم کی سلامتی سے ہو اسے سوشل میڈیا یا عام محفلوں میں ڈسکس کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کرنا اور اسے ذمہ دار لوگوں تک پہنچنے دینا ایمان کا تقاضا ہے۔ بغیر تصدیق اور بغیر اجازت خبر پھیلانا فتنہ ہے اسی لیے اسے گناہ کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مومنین کا اپنے مقتدا اور اولو الامر پر کامل اعتماد ہونا چاہیے۔ اگر عوام اور قیادت کے درمیان رابطہ ٹوٹ جائے اور عوام اپنی مرضی سے خبریں اڑانے لگیں تو معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

چہارم: تکریمِ انسانیت اور فضیلتِ بنی آدم

اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا[9]

اور ہم نے آدم علیہ السلام کی اولاد کو عزت دی اور ان کو خشکی اور دریا میں (سواریوں پر) سوار کیا اور ان کو ستھری چیزوں سے رزق دیا اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی۔

اس آیت میں اللہ رب العزت اعلان فرماتے ہیں کہ اس نے تمام بنی آدم کو عزت اور شرف عطا کیا خواہ وہ کسی نسل، قوم یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس عزت کی عملی صورت یہ بیان کی گئی کہ انسان کو خشکی اور سمندر میں چلنے اور سفر کرنے کی سہولت دی گئی یعنی زمین اور پانی دونوں اس کے لیے قابلِ استعمال بنائے گئے۔ اسی طرح پاکیزہ رزق عطا کیا گیا جو اس بات کی علامت ہے کہ انسان کی جسمانی بقا اور باعزت زندگی اللہ کی مشیت کا حصہ ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں طاقت، قوت اور عسکری تیاری کا مقصد انسان کو ذلیل کرنا یا اس پر ظلم ڈھانا نہیں ہے بلکہ اس عزت کی حفاظت کرنا ہے جو اللہ نے خود انسان کو عطا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ کی سیرت میں جنگ ہمیشہ آخری چارۂ کار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ نبی ﷺ نے جنگ کے بھی واضح اخلاقی اصول مقرر فرمائے جن میں بے گناہوں کا قتل، عورتوں، بچوں اور کمزوروں کو نقصان پہنچانا اور لاشوں کی بے حرمتی سختی سے منع ہے۔ یہ آیت فقہ السیرۃ کا یہ بنیادی اصول واضح کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کی قوت اور دفاعی صلاحیت انسانی جان، عزت اور وقار کے تحفظ کے لیے ہوتی ہے نہ کہ جبر، انتقام یا بے جا خونریزی کے لیے۔

پنجم: حالتِ اکراہ میں رخصت اور ایمانی اثبات

اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ[10]

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے سوائے اس کے جس پر (کفر کے کلمے کہنے پر) جبر کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو لیکن جو لوگ کھلے دل سے کفر کو قبول کر لیں تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس آیت سے یہ فقہی قاعدہ نکلتا ہے کہ اگر کسی مسلمان کو جان سے مار دینے یا شدید جسمانی اذیت کی دھمکی دے کر کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو جان بچانے کے لیے زبان سے ایسے الفاظ ادا کرنے کی اجازت ہے۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو مشرکین نے اس قدر اذیت دی کہ انہوں نے جان بچانے کے لیے بظاہر وہ الفاظ کہے جو مشرکین چاہتے تھے۔ جب وہ روتے ہوئے نبی ﷺ کے پاس آئے تو نبی ﷺ نے پوچھا تمہارے دل میں کیا تھا؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرا دل ایمان کے جذبوں سے معمور تھا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اگرچہ جان بچانے کے لیے زبان سے کلمہ کفر کہنا رخصت ہے لیکن حق پر ڈٹ کر جان دے دینا عزیمت ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے والد یاسر رضی اللہ عنہ اور والدہ سمیہ رضی اللہ عنہا نے کلمہ کفر کہنے سے انکار کر دیا اور جامِ شہادت نوش کیا جسے اسلام میں بہت بلند مقام دیا گیا۔ فقہ السیرہ کا ایک بڑا اصول یہ معلوم ہوا کہ ایمان کا اصل مرکز دل ہے۔ اگر زبان سے دباؤ میں کوئی غلط بات نکل جائے لیکن دل اللہ کی توحید پر جما رہے تو وہ شخص اللہ کے ہاں مومن ہی رہے گا۔ شریعت میں احکام کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ ایک ہی جملہ (کلمہ کفر) اگر کوئی خوشی سے کہے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی مجبور ہو کر کہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

ششم: عسکری حکمتِ عملی اور اذنِ الٰہی

قرآن میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِيْنَ[11]

جو کچھ تم نے کھجور کے درخت کاٹے یا جنہیں ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس

لیے کہ وہ فاسقوں کو رسوا کرے۔

جب بنو نضیر نے اپنی بدعہدی اور غرور میں آکر مدینہ چھوڑنے سے انکار کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کو چیلنج کیا تو نبی ﷺ نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے صحابہ رضوان اللہ اجمعین کے ساتھ ان کا محاصرہ کر لیا۔ اس کٹھن وقت میں وہ منافقین بھی پیچھے ہٹ گئے جنھوں نے یہودیوں کو مدد کا یقین دلایا تھا۔ جنگ کے دوران ایک ایسا مرحلہ آیا جب مسلمانوں کو حکمتِ عملی کے طور پر ان کے کھجور کے درخت کاٹنے پڑے۔ یہ فیصلہ بظاہر مشکل تھا لیکن اس کا مقصد دشمن کی معاشی کمر توڑنا اور انہیں قلعوں سے باہر آنے پر مجبور کرنا تھا۔ پندرہ دن کی اس سخت ناکہ بندی نے یہودیوں کے حوصلے پست کر دیے اور وہ اللہ کے رعب سے اس قدر مغلوب ہوئے کہ بغیر خون بہائے ہتھیار ڈالنے پر تیار ہو گئے۔ بالآخر وہ اپنی جانیں بچا کر مدینہ سے نکلنے پر راضی ہوئے اور صرف اتنا سامان ساتھ لے گئے جو وہ اپنے اونٹوں پر لاد سکتے تھے۔ عام حالات میں اسلام نباتات اور درختوں کو کاٹنے سے منع کرتا ہے لیکن یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اگر جنگی ضرورت پیش آ جائے تو دشمن کی معاشی طاقت یا ان کے دفاعی حصار کو توڑنے کے لیے درخت کاٹنا یا املاک کو نقصان پہنچانا جائز ہے۔ لہذا جنگی مصلحت عام اخلاقی پابندیوں پر بوقت ضرورت مقدم ہو سکتی ہے۔

دوسرا اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض اقدامات دشمن کے حوصلوں کو پست کرنے اور انہیں ذہنی طور پر مغلوب کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ جب بنو نضیر نے دیکھا کہ ان کے قیمتی باغات کٹ رہے ہیں تو وہ اندرونی طور پر ٹوٹ گئے اور صلح پر مجبور ہو گئے۔ دوسری طرف یہودیوں نے درخت کاٹنے کو "فساد فی الارض" قرار دے کر اخلاقی برتری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ قرآن نے اس کا دفاع کرتے ہوئے بتایا کہ اللہ کے حکم سے کیا جانے والا کام فساد نہیں بلکہ حق کی بالادستی کا ذریعہ ہے۔ یہ آیت حکمرانِ وقت کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ جنگ کے دوران دشمن کے مال و اسباب کے بارے میں بہترین فیصلہ کرے۔ چاہے اسے بچا کر غنیمت کے طور پر حاصل کرے یا دشمن کو دباؤ میں لانے کے لیے تلف کر دے۔

ہفتم: مساواتِ انسانی اور قرآنی تادیب

اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

عَبَسَ وَتَوَلّٰی۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی۔[12]

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ اس بات پر کہ اس کے پاس ایک اندھا آیا۔

جب نبی ﷺ قریش کے بڑے سرداروں (جن میں عتبہ، شیبہ اور ابو جہل شامل تھے) کو اسلام کی دعوت دینے میں مصروف تھے۔ نبی ﷺ کی دلی خواہش تھی کہ اگر یہ بااثر لوگ ایمان لے آئے تو دعوتِ دین کو بڑی قوت ملے گی۔ اسی دوران حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جو ایک نابینا صحابی تھے وہاں حاضر ہوئے اور اپنی معذوری کی وجہ سے مجلس کی نوعیت کو نہ بھانپ سکے۔ نبی ﷺ اس وقت سرداروں کے ساتھ گفتگو میں اتنے منہمک تھے کہ ایک دم کسی کی مداخلت نبی ﷺ کو گراں گزری۔ نبی ﷺ نے ان کی طرف توجہ نہیں دی اور نبی ﷺ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے (جسے قرآن نے عبس یعنی تیوری چڑھانا کہا ہے)۔ نبی ﷺ نے خاموشی سے ان سے رخ موڑ کر اپنی گفتگو جاری رکھی۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے فوراً وحی نازل فرما کر اپنے محبوب ﷺ کو پیار بھرے انداز میں ٹوکا کہ آپ ان لوگوں کی فکر کر رہے ہیں جو ہدایت سے بے پرواہیں جبکہ ایک تڑپ رکھنے والا مومن آپ کے پاس چل کر آیا ہے۔ اس واقعے کے بعد نبی ﷺ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا بے حد احترام فرماتے اور انہیں دیکھ کر اکثر فرمایا کرتے تھے کہ خوش آمدید ہے اس شخص کو جس کے بارے میں میرے رب نے مجھے عتاب فرمایا۔

ان آیات سے یہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ ایک داعی دین کے لیے طالب ہدایت اس شخص پر مقدم ہے جس کے بارے میں صرف یہ امید ہو کہ شاید وہ ہدایت پالے۔ نبی ﷺ سرداروں کی طرف اس لیے متوجہ تھے کہ ان کے اسلام لانے سے بڑے پیمانے پر خیر کی امید تھی۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ جو شخص خود چل کر علم سیکھنے آیا ہے وہ زیادہ توجہ کا مستحق ہے خواہ وہ کتنا ہی غریب یا معذور کیوں نہ ہو۔ اسی سے معلوم ہوا کہ اسلامی معاشرت میں انسان کی قدر و قیمت اس کے تقویٰ اور طلبِ حق سے ہے نہ کہ اس کے سماجی رتبے سے۔ دوسرا یہ کہ نبی کریم ﷺ کا اعراض کرنا کسی تکبر کی بنا پر نہیں تھا بلکہ تبلیغ دین کی تڑپ کی وجہ سے تھا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ایک اعلیٰ معیار قائم کرنے کے لیے اس پر گرفت فرمائی تا کہ قیامت تک کے لیے داعیوں کے لیے ایک ضابطہ اخلاق طے ہو جائے۔

ہشتم: دعوت الی اللہ میں بصیرت اور علمی برتری

اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ[13]

کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ۔ میں بھی اور وہ لوگ بھی جو میری پیروی کرتے ہیں اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اس آیت کا بنیادی مقصد ہی دعوت ہے۔ "اَدْعُوْٓ اِلَى اللّٰهِ" سے معلوم ہوا کہ دعوت کا مرکز کوئی شخصیت، گروہ یا سیاست نہیں بلکہ صرف اللہ کی ذات ہونی چاہیے۔ "قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ" اس سے معلوم ہوا کہ داعی کو اپنے نظریے پر اتنا یقین ہونا چاہیے کہ وہ علی الاعلان اپنے راستے کی نشاندہی کر سکے۔ "سُبْحٰنَ اللّٰهِ" کہہ کر داعی یہ واضح کرتا ہے کہ سارا کمال اللہ کا ہے اور وہ خود کو ہر قسم کی باطل نسبتوں (یعنی شرک) سے دور رکھتا ہے دعوت یا تعلیم صرف جذباتی نہیں ہونی چاہیے بلکہ بصیرت پر مبنی ہونی چاہیے۔ یہ اندھی تقلید کی نفی کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ بس میری بات مان لو بلکہ فرمایا دلیل کے ساتھ مانو۔ یہ سائنسی اور تعلیمی ترقی کی بنیاد ہے کہ ہر دعوے کے پیچھے ٹھوس ثبوت ہونا چاہیے۔ ایک استاد یا مربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ طالبِ علم کو اس طرح پڑھائے کہ اس کے اندر حقیقت کو دیکھنے کی آنکھ پیدا ہو جائے۔ یہ آیت مسلمانوں کو ترغیب دیتی ہے کہ اپنے دین کو دلیل اور عقل کے ساتھ سمجھیں تا کہ وہ دوسروں کو مطمئن کر سکیں۔ دوسرا یہ کہ ایک عام مسلمان کو بھی وہی دلیل معلوم ہونی چاہیے جو اس کے رہبر کو معلوم ہے۔ یہ سماج میں علمی برابری پیدا کرتا ہے۔ ایک بہترین استاد یا لیڈر وہ نہیں ہوتا جو لوگوں کو اپنا محتاج بنالے بلکہ وہ ہوتا ہے جو اپنے شاگردوں کو اپنے برابر کھڑا کر دے۔ "اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ" سے یہی پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے صحابہ رضوان اللہ اجمعین کی ایسی ذہنی تربیت کی کہ وہ بھی اسی بصیرت کے حامل ہو گئے جس پر خود نبی ﷺ تھے۔

قرآن کریم میں بیان کردہ فقہ السیرہ کے ان اصولوں کا اثر بعد میں لکھی جانے والی تفاسیری خدمات پر گہرا نظر آتا ہے۔ خاص طور پر برصغیر کی قدیم اردو تفاسیر نے ان قرآنی و سیرتی مباحث کو محض نظری حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ مفسرین نے ان کے فکری، اخلاقی، فقہی اور اجتماعی پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان تفاسیر کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سیرتِ نبوی ﷺ کے فقیہانہ احکام نے اردو تفسیری ادبیات کی تشکیل اور ان کے فکری ارتقاء میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

قدیم اردو تفاسیر میں مباحثِ فقہ السیرۃ

اردو تفسیری ادبیات میں فقہ السیرہ کی فکری و عملی تطبیق کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ برصغیر کے مفسرین نے قرآن مجید کے فقیہانہ اور اخلاقی احکام کو سیرتِ طیبہ ﷺ کے عملی نمونے کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا ہے۔ اس مطالعے کا بنیادی مقصد یہ سمجھنا ہے کہ

اردو تفاسیر نے کس طرح قرآنی آیات سے حیاتِ نبوی ﷺ کے فکری، دعوتی اور عملی احکام کو واضح کیا اور دورِ جدید کے علمی و اجتماعی مسائل کا حل فراہم کیا۔

قدیم اردو تفاسیر کا ارتقا

اردو تفاسیر کا ارتقا برصغیر کے دینی، تعلیمی اور سماجی حالات کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ابتدا میں قرآن فہمی کا مقصد عام مسلمانوں تک معانی پہنچانا تھا اس لیے ترجمہ پر زیادہ توجہ دی گئی جیسے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے خانوادے اور ان کے بعد کے مترجمین کی کوششیں۔ رفتہ رفتہ تفسیری اسلوب میں وسعت آئی اور عقلی، فقہی، اصلاحی اور دعوتی پہلو شامل ہوتے گئے چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا مودودی رحمہ اللہ کی تفاسیر اپنے اپنے فکری و عصری تقاضوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یوں اردو تفاسیر سادہ ترجمے سے آگے بڑھ کر جامع فکری، عملی اور عصری رہنمائی کا ذریعہ بن گئیں جن میں قرآن کو زندگی کے اجتماعی و انفرادی مسائل سے جوڑ کر پیش کیا گیا۔

اس تحقیق میں نبی کریم ﷺ کی سیرت کے فقہی و عملی، اخلاقی و روحانی اور دعوتی، تعلیمی و سماجی پہلوؤں کے استنباط کے لیے مختلف اردو تفاسیر سے منتخب آیات کا مطالعہ کیا گیا ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

- تفسیر عثمانی از علامہ شبیر احمد عثمانی
- تفہیم القرآن از سید ابو الاعلیٰ مودودی
- معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی

ہر تفسیر سے ایک ایک آیت کو بنیاد بنا کر نبی ﷺ کے مذکورہ پہلوؤں کو الگ الگ زاویوں سے واضح کیا گیا ہے جس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ اگرچہ مفسرین کا اسلوب اور اندازِ بیان مختلف ہے تاہم ان سب کی تشریحات نبی ﷺ کی جامع شخصیت پر متفق ہیں۔ کہیں فقہی احکام اور عملی نمونہ نمایاں ہوتا ہے کہیں اخلاقی تطہیر اور روحانی تربیت کا پہلو غالب نظر آتا ہے اور کہیں دعوت، تعلیم اور سماجی اصلاح کے اصول نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اس تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید نبی ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کو ایک ہمہ جہت رہنما کے طور پر پیش کرتا ہے جس کی سیرت ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی فراہم کرتی ہے اور یہی جامعیت اردو تفاسیر کے مختلف اسالیب کے ذریعے مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔

قدیم اردو تفاسیر میں اخلاقی و روحانی پہلو

قدیم اردو تفاسیر کی روایت میں اخلاقی و روحانی مباحث کو ایک خاص علمی مقام حاصل ہے۔ مختلف مفسرینِ کرام نے قرآنی پیغامات کو عوامی فہم کے مطابق اخلاقی رنگ میں ڈھال کر پیش کیا ہے، جس کی چند اہم مثالیں درج ذیل ہیں:

اوّل: تفسیر عثمانی از علامہ شبیر احمد عثمانی

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تفسیر میں قرآنی احکامات اور ان کے عملی اطلاق کو نہایت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے سورہ صف کی ان آیات کی روشنی میں قول و فعل کے تضاد پر جو علمی گرفت کی ہے، وہ عملی زندگی کے لیے ایک اہم مثال ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ[14]

مومنو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے؟ اللہ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم وہ کہو جو خود نہ کرو۔

علامہ شبیر احمد عثمانی آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

"بندہ کو لاف زنی اور دعوے کی بات سے ڈرنا چاہئے کہ پیچھے مشکل پڑتی ہے۔ زبان سے ایک بات کہہ دینا آسان ہے، لیکن اس کا نباہنا آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص سے سخت ناراض اور بیزار ہوتا ہے جو زبان سے کہے بہت کچھ اور کرے کچھ نہیں۔ روایات میں ہے کہ ایک جگہ مسلمان جمع تھے، کہنے لگے ہم کو اگر معلوم ہو جائے کہ کونسا کام اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے تو وہی اختیار کریں۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ یعنی دیکھو! سنبھل کر کہو"[15]

نبی کریم ﷺ کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ آپ ﷺ کا قول اور فعل ایک تھا۔ ان آیات میں جس "تضاد" کی ممانعت کی گئی ہے آپ ﷺ اس سے پاک تھے۔ آپ ﷺ نے جس کام کا حکم دیا سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ مثال کے طور پر جب صدقہ و خیرات کی ترغیب دی تو خود سب سے زیادہ سخی ثابت ہوئے۔ یہ آیات منافقت کی بیخ کنی کرتی ہیں۔ نبی ﷺ کی روحانی بلندی یہ تھی کہ آپ ﷺ نبوت سے پہلے بھی "صادق اور امین" مشہور تھے۔ روحانیت کی بنیاد سچائی پر ہے۔ اگر انسان کے اندر اور باہر میں فرق ہو تو روحانی ترقی ممکن نہیں۔ اور آپ ﷺ کی شخصیت میں تو ظاہر اور باطن کی یکسانیت انتہا پر تھی۔ ایک مومن اور خاص طور پر ایک نبی کا اخلاق اللہ کے خوف اور اس کی محبت پر مبنی ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر لمحہ اس احساس میں گزرا کہ اللہ دیکھ رہا ہے اسی لیے آپ ﷺ کے کلام اور عمل میں کبھی تضاد نہیں آیا۔ ایک رہنما کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہی کہے جو وہ کرتا ہو۔ دوسرا یہ کہ ان آیات سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف تبلیغ نہیں کی بلکہ اپنی زندگی کو ایک زندہ قرآن بنا کر پیش کیا۔ ویسے بھی جب قول و فعل ایک ہوں تبھی تو کلام میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کی دعوت کی کامیابی کی بڑی وجہ یہی تھی کہ لوگ آپ ﷺ کے عمل کو آپ ﷺ کے لفظوں کی تصدیق کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔ یہ آیات ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ کے ہاں وہی شخصیت محبوب ہے جس کا عمل اس کے قول کے مطابق ہو۔ نبی کریم ﷺ اس صفت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے جہاں آپ ﷺ کی پوری زندگی حق اور سچائی کی عملی تصویر تھی۔

دوم: تفہیم القرآن از سید ابو الاعلیٰ مودودی

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے "تفہیم القرآن" میں قرآنی احکامات کو ایک مکمل نظامِ زندگی کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کی تفسیر میں اخلاقی اقدار اور ان کے عملی پہلوؤں کو خاص اہمیت حاصل ہے، جس کی ایک مثال سورہ زمر کی اس آیت میں دیکھی جا سکتی ہے جس میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

قُلْ اِنِّیٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ[16]

(اے نبی ﷺ) ان سے کہہ دیجیے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"یعنی میرا کام صرف دوسروں سے کہنا ہی نہیں ہے خود کر کے دکھانا بھی ہے۔ جس راہ پر لوگوں کو بلاتا ہوں اس پر سب سے پہلے میں خود چلتا ہوں۔"[17]

مفسر نے یہاں ایک عظیم اخلاقی پہلو بیان کیا ہے کہ ایک رہبر صرف زبانی تبلیغ نہیں کرتا بلکہ خود اس نمونے پر عمل کر کے دکھاتا ہے جس کی وہ دعوت دے رہا ہے۔ دوسری طرف یہ نبی ﷺ کی روحانی جرات اور اخلاقی برتری کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ

نے نیکی کے راستے پر چلنے میں پہل کی نہ کہ دوسروں کو تجربے کے طور پر آگے بھیجا۔ آیت کی ابتدا "أُمِرْتُ" سے ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ نبی اللہ کے سامنے خود کو ایک مأمور اور بندہ سمجھتے ہیں۔ یہ پہلو تکبر کے خاتمے اور مکمل سپردگی کی نشاندہی کرتا ہے۔ روحانی طور پر یہ آیت بتاتی ہے کہ دل میں اللہ کے سوا کسی اور کی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ "دین کو خالص کرنا" اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی وفاداری، محبت اور ڈر صرف اللہ کے لیے ہو۔ جب انسان اللہ کے لیے مخلص ہو جاتا ہے تو وہ دنیاوی مشکلات کی پرواہ نہیں کرتا۔ نبی ﷺ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ واضح ہو جائے کہ آپ کا راستہ متعین ہے اور اس میں کوئی سمجھوتہ یا لچک نہیں ہے۔ اس آیت کا سب سے اہم پہلو یہاں "مُخْلِصًا" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ نبی ﷺ کی تمام تر عبادت، محنت اور زندگی کا مقصد صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی ہے۔ اخلاص کا یہ روحانی درجہ انسان کو ریاکاری اور دکھاوے سے پاک کر دیتا ہے۔

سوم: معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے اپنی اس تفسیر میں شرعی احکامات کی عملی صورتوں اور ان سے اخذ ہونے والے نتائج کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اخلاقی و عملی زندگی کے حوالے سے ان کے اسلوب کی ایک نمایاں مثال اس آیت میں دیکھی جا سکتی ہے جس میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[18]

اے نبی ﷺ! آپ کیوں حرام کرتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

"صحیحین و دیگر کتبِ حدیث میں اس سورت کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں آنحضرت ﷺ کچھ دیر حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس ٹھہر جایا کرتے تھے جبکہ آپ کا معمول تھا کہ عصر کے بعد تمام ازواج کے حجروں میں تشریف لے جاتے تاکہ اُن کے احوال کا علم ہو سکے اور ازواجِ مطہرات کے لیے آپ کی زیارت و تشریف آوری موجبِ برکت و راحت ہو، اس وقت حضرت زینب کے پاس شہد آیا ہوا تھا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو پلایا تو دو چار روز اس کے نوش فرمانے میں دیر لگی اور حضرت عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما کے یہاں پہنچنے میں تاخیر پر ان کو بے چینی ہوئی۔ آنحضرت ﷺ کو شہد اور میٹھی چیز پسند تھی تو یہ بات ظاہر ہونے پر حضرت عائشہ اور حفصہ نے باہمی مشورہ سے یہ طے کیا کہ ہم میں سے جس کسی کے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائیں تو ہم یہ کہیں کہ یا رسول اللہ آپ کے منہ سے تو مغافیر (ایک قسم کے گوند کو کہا جاتا ہے) کی بدبو آ رہی ہے تاکہ آپ اس چیز کو ترک کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، بیان کرتی ہیں جب آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو میں نے کہا میں تو آپ کے منہ سے مغافیر کی بدبو محسوس کر رہی ہوں آپ نے مغافیر کھایا ہے۔ اس کے بعد آپ حفصہ رضی اللہ عنہا کے یہاں گئے تو انہوں نے بھی اسی طرح کہا۔ آپ نے فرمایا نہیں میں نے تو شہد پیا ہے۔ اس پر آپ نے طبعی ناگواری کے ساتھ فرمایا خدا کی قسم میں اب شہد نہیں پیوں گا تو اس طرح آپ نے اپنی قسم کے ذریعے ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔"[19]

آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کی خوشی کی خاطر ایک حلال چیز (شہد وغیرہ) کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ یہ آپ ﷺ کے اخلاقی

حسن کی دلیل ہے کہ آپ گھر والوں کے جذبات کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ ان کی خاطر اپنی راحت قربان کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ یہاں جو اللہ رب العزت نے فرمایا تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ اس سے معلوم ہوا کہ ایک نبی کا اصل مقصد صرف اللہ کی رضا ہونا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فوراً اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنی قسم یا فیصلے سے رجوع کیا۔ یہ آپ ﷺ کے روحانی مقام کی بلندی ہے کہ اللہ کی تنبیہ پر ذرہ برابر بھی انا کو آڑے نہیں آنے دیا۔ اس آیت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ بشر بھی تھے اور نبی بھی۔ کیونکہ آپ ﷺ کو بھی اپنوں کی ناراضگی کا احساس ہوتا تھا اور آپ ﷺ جذباتی طور پر ان کو خوش کرنا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر گوشہ اللہ کی نگرانی میں تھا۔ اگر آپ ﷺ سے کوئی ایسا اجتہاد ہوا جو اللہ کی منشا کے خلاف تھا تو اللہ نے فوراً اصلاح فرمائی تاکہ امت کے لیے دین کامل رہے۔

دوسرا یہ کہ تقویٰ کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنی طرف سے حلال چیزوں کو حرام کر لے۔ آپ ﷺ کے اس واقعے سے امت کو یہ اخلاقی سبق ملا کہ اعتدال ہی اصل نیکی ہے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو بغیر شرعی وجہ کے ترک کرنا مطلوبِ الٰہی نہیں ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اخلاق کے اس بلند درجے پر تھے جہاں وہ اپنوں کی خاطر اپنی ذات کو مشقت میں ڈال لیتے تھے لیکن ان کا روحانی تعلق اللہ سے اتنا مضبوط تھا کہ وہ اللہ کی مرضی سامنے آتے ہی اپنی ہر خواہش اور فیصلے کو ترک کر دیتے تھے۔ فقہی اعتبار سے یہاں سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی جائز کام کو نہ کرنے کی قسم کھا لے تو اسے وہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دینا چاہیے بجائے اس کے کہ وہ اس جائز چیز سے ہمیشہ محروم رہے۔ عام انسان کے لیے کسی مصلحت (مثلاً بیماری یا کسی کو ناراضگی سے بچانے) کی خاطر شہد نہ پینا جائز ہے۔ لیکن نبی ﷺ کا مقام چونکہ قانون ساز اور اسوہ کا ہے اس لیے آپ ﷺ کا ایسا کرنا امت کے لیے تشریع کا باعث بن سکتا تھا اس لیے اللہ نے اسے پسند نہیں فرمایا۔

قدیم اردو تفاسیر میں فقہی و عملی پہلو

قدیم اردو تفاسیر میں اخلاقی و روحانی مباحث کے ساتھ ساتھ فقہی احکامات اور عملی زندگی کے مسائل کو بھی تفصیلی مقام حاصل ہے۔ مفسرین نے قرآنی آیات سے جہاں باطنی اصلاح کے پہلو نکالے ہیں، وہاں ان سے روزمرہ زندگی کے شرعی ضابطوں اور عملی زندگی کے تقاضوں کی بھی وضاحت کی ہے۔ اس ضمن میں منتخب تفاسیر کا مطالعہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے:

اوّل: تفسیر عثمانی از علامہ شبیر احمد عثمانی

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں فقہی احکامات اور حدود و تعزیرات کو نہایت واضح اور دوٹوک انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے سورہ نور کی اس آیت کے تحت زنا کی شرعی سزا کی جو تشریح کی ہے، وہ مفسر کے فقہی اسلوب کی ایک نمایاں مثال ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت اس آیت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ[20]

بدکار عورت اور بدکار مرد پس دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور تمہیں اللہ کے معاملہ میں ان پر ذرا رحم نہ آنا چاہیے اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہیے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں کہ:

"زنا کرنے والے مرد وعورت کی سزا100 کوڑے ہیں۔ 1: مجرم پر ترس کھا کر سزاؤں میں تبدیلی کی ممانعت: اگر اللہ پر یقین رکھتے ہو تو اس کے احکام و حدود جاری کرنے میں کچھ پس و پیش نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ مجرم پر ترس کھا کر سزا بالکل روک دو یا اس میں کمی کرنے لگو یا سزا دینے کی ایسی ہلکی اور غیر مؤثر طرز اختیار کرو کہ سزا سزا نہ رہے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ حکیم مطلق اور تم سے زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اس کا کوئی حکم سخت ہو یا نرم مجموعہ عالم کے حق میں حکمت و رحمت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم اس کے احکام و حدود کے اجراء میں کوتاہی کرو گے تو آخرت کے دن تمہاری پکڑ ہو گی۔ 2: منظرِ عام پر سزا دینے کا حکم: یعنی سزا تنہائی میں نہیں، مسلمانوں کے مجمع میں دینی چاہیے کیونکہ اس رسوائی میں سزا کی تکمیل و تشہیر اور دیکھنے سننے والوں کے لئے سامانِ عبرت ہے۔ اور شاید یہ بھی غرض ہو کہ دیکھنے والے مسلمان اس کی حالت پر رحم کھا کر عفو و مغفرت کی دعا کریں گے۔"[21]

غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ دونوں کے لیے مقررہ سزا100 کوڑے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کے دین کے معاملے میں تمہیں ان پر ترس نہ آئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جرم ثابت ہونے کے بعد سزا میں کمی یا سفارش کی بنیاد پر اسے ختم کرنا جائز نہیں تاکہ معاشرے میں عبرت قائم رہے۔ آیت کے آخر میں ہدایت دی گئی کہ سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے۔ اس کا مقصد مجرم کو رسوا کرنا اور دوسروں کے لیے عبرت کا سامان بنانا ہے۔ سزا کے معاملے میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں اس لیے آیت میں دونوں کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے۔ دوسری طرف فقہاء کے مطابق کوڑے مارتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کوئی عضو ضائع نہ ہو اور نہ ہی تمام کوڑے ایک ہی جگہ مارے جائیں۔

قرآن میں صرف 100 کوڑوں کا ذکر ہے لیکن سیرتِ طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے شادی شدہ زانی کے لیے رجم کا فیصلہ فرمایا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سنتِ نبوی قرآن کی تشریح اور اس کی حدود متعین کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ "اگر فاطمہ بنتِ محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود کے نفاذ میں آپ ﷺ نے کبھی کسی اثر و رسوخ یا سفارش کو قبول نہیں فرمایا۔ دوسرا یہ کہ آپ ﷺ جرم کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ اگر کوئی خود آ کر اقرار کرتا تو آپ ﷺ اسے توبہ کا موقع دیتے۔ لیکن جب جرم گواہوں سے ثابت ہو جاتا تو پھر حد نافذ فرماتے۔ سورۃ النور کی یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ معاشرے کی پاکیزگی برقرار رکھنے کے لیے جہاں اخلاقی تربیت ضروری ہے وہاں قانون کا نفاذ بھی ناگزیر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس قانون کو اس طرح نافذ فرمایا کہ انسانیت کا احترام بھی باقی رہا اور معاشرہ برائیوں سے بھی پاک ہو گیا۔ انسانیت کا ایک احترام یہ بھی ہے کہ کسی بے گناہ کو سزا نہ ملے۔ آپ ﷺ نے زنا کی سزا کے لیے چار عینی گواہوں کی ایسی سخت شرط رکھی جو عملی طور پر تبھی ممکن ہے جب جرم بالکل کھلے عام ہو رہا ہو۔ اس کا مقصد مجرم کو سزا دینا کم اور معاشرے میں اعلانیہ بے حیائی کو روکنا زیادہ تھا۔

دوم: تفہیم القرآن از سید ابو الاعلیٰ مودودی

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے "تفہیم القرآن" میں قرآنی احکامات کے عملی اور سماجی اطلاق پر گہری بحث کی ہے۔ انہوں نے سورہ احزاب کی اس آیت کے ذیل میں جاہلانہ رسوم کے خاتمے اور لے پالک اولاد سے متعلق شرعی و عملی ضابطوں کو نہایت مدلل انداز میں واضح کیا ہے، جس کی مثال اس آیت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ

مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا[22]

اور (اے پیغمبر ﷺ) یاد کرو وہ وقت جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے بھی احسان کیا تھا اور تم نے بھی احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اسے تمہارے نکاح میں دے دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے جب وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر لیں اور اللہ کا حکم تو ہو کر رہنے والا ہے۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

"یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت زید رضی اللہ عنہ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے اور انھوں نے بار بار شکایات پیش کرنے کے بعد آخر کار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم مان کر ان کے نکاح میں جانا قبول کر لیا تھا لیکن وہ اپنے دل سے اس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زید رضی اللہ عنہ ایک آزاد کردہ غلام ہیں اُن کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں اور وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کم تر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں انھوں نے کبھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنے برابر کا نہ سمجھا اور اسی وجہ سے دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔"[23]

معلوم ہوا کہ فقہ میں "کفاءت" کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کے وقت میاں بیوی کے درمیان سماجی، خاندانی اور معاشی لحاظ سے مناسبت ہو۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے درمیان مزاج اور سماجی حیثیت کا جو فرق تھا اس نے ثابت کیا کہ اگر میاں بیوی کے درمیان ذہنی اور سماجی ہم آہنگی نہ ہو تو نباہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اس واقعے سے یہ فقہی پہلو بھی نکلتا ہے کہ اگر کوئی شادی محض حکم کی تعمیل یا کسی دباؤ میں کی جائے اور اس میں دل کی آمادگی شامل نہ ہو تو ایسی شادی میں تلخی پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اللہ اور رسول ﷺ کے حکم پر سر تسلیم خم تو کر دیا لیکن انسانی جذبات پر پوری طرح قابو نہ پا سکیں جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں دلی میلان نہایت ضروری ہے۔ جب تمام تر کوششوں کے باوجود حالات درست نہ ہوئے اور تلخیاں بڑھ گئیں تو اسلام نے طلاق کو ایک حل کے طور پر قبول کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام ایک فطری دین ہے۔ اگر دو افراد کا ساتھ رہنا اذیت بن جائے تو زبردستی رشتہ برقرار رکھنے کی بجائے وقار کے ساتھ علیحدگی اختیار کرنا بہتر ہے۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی مزید آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں نے اس فقرے کا الٹا مطلب یہ نکال لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کے خواہش مند تھے اور آپ ﷺ کا جی چاہتا تھا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ ان کو طلاق دے دیں مگر جب انہوں نے آکر عرض کیا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپ ﷺ نے معاذ اللہ! اوپری

دل سے ان کو منع کیا اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ "تم دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔" حالانکہ اصل بات اس کے بالکل برعکس ہے۔"[24]

معلوم ہوا کہ ایک مصلح اور قائد کو بعض اوقات حق کی بالادستی کے لیے عوامی تنقید اور "لوگ کیا کہیں گے" کے خوف کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے۔ اللہ کا خوف، لوگوں کے خوف پر غالب ہونا چاہیے۔ اگر کوئی کام اللہ کے حکم سے ہو رہا ہو تو معاشرتی دباؤ کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اس پورے واقعے کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی بڑی مصلحت تھی یعنی لے پالک کے حقیقی بیٹا نہ ہونے کے قانون کو عملی طور پر نافذ کرنا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی طلاق کے بعد اللہ کے حکم سے نبی ﷺ کا حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا تا کہ یہ جاہلانہ رسم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح حرام ہے۔ دوسرا یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی بشری طور پر تکلیف دہ حالات یا بدنامی کے اندیشوں کو محسوس کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ ان کی تربیت فرما کر انہیں "اُولو العزمی" کے اس مقام پر لے جاتا ہے جہاں وہ صرف اللہ سے ڈرتے ہیں۔ دوسری طرف آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صدیوں سے جڑی ہوئی سماجی برائیوں اور غلط رسومات کو محض تقریر سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مصلحِ امت کو چاہیے کہ وہ مشکل ترین اصلاحی کام کا آغاز اپنی ذات یا اپنے گھر سے کرے۔ اللہ نے نبی ﷺ کو اس مشکل امتحان میں اس لیے ڈالا تا کہ رہتی دنیا تک کوئی اس رسم کو دوبارہ زندہ نہ کر سکے۔

اس آیت سے یہ فقہی مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ نبی پر جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ اسے من و عن پہنچانے کا پابند ہے چاہے اس میں بظاہر اپنی ذات پر عتاب یا تنقید ہی کیوں نہ ہو۔ یہ آپ ﷺ کی امانت اور صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے وہ الفاظ بھی امت کو سنائے جس میں اللہ نے آپ کی بشری لغزش پر ٹوکا تھا۔ نبی کریم ﷺ کا حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یہ کہنا کہ "اپنی بیوی کو روکے رکھو" آپ کی خواہش تھی کہ گھر ٹوٹنے سے بچ جائے جبکہ اللہ کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کا ہر قول "حکم" نہیں ہوتا بعض اوقات وہ ایک ہمدرد انسان کے طور پر مشورہ دیتے ہیں جبکہ شریعت کا حتمی حکم وحی الٰہی سے طے ہوتا ہے۔

سوم: معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے اپنی اس تفسیر میں شرعی مباحث کے ساتھ ساتھ ایمانی اور روحانی کیفیات کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے قربت اور ان کی پکار سننے کے حوالے سے ان کے اسلوب کی ایک نمایاں مثال اس آیت میں دیکھی جا سکتی ہے: اللہ رب العزت نے فرمایا:

> قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ[25]
>
> اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ سے فریاد کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ یقیناً اللہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔
>
> مولانا محمد ادریس کاندھلوی آیت کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں:
>
> "ابتداءِ سورت اس مجادلہ اور جھگڑے کے قصہ سے فرمائی گئی جو خولہ بنتِ ثعلبہ کا اپنے خاوند سے پیش آیا تھا کہ ان کے خاوند اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے ظہار کر کے ان کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا تو خولہ بنتِ ثعلبہ رضی اللہ عنہا شکایت کرتی ہوئی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس وقت تک کوئی حکم شرعی اس بارے میں نازل نہیں ہوا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص اپنی عورت کو اپنے پر حرام کرنے

کا ارادہ کرتا تو اپنی بیوی کو کہہ دیتا "اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّی" کہ تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ تو یہ آہ و زاری کرتی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا بس تو اپنے خاوند پر حرام ہو گئی ہے خولہ رضی اللہ عنہا بار بار کہتی رہی یا رسول اللہ اس نے مجھے طلاق نہیں دی اور مسلسل آنحضرت ﷺ سے التجا کرتی رہیں اور اس دوران یہ بھی کہا یا رسول اللہ میرے خاوند نے میرا مال بھی کھایا میری جوانی بھی گزر گئی عمر بڑی ہو چکی میری اولاد مجھ سے جدا ہو چکی اب میں کیا کروں پھر پروردگار کی طرف رُخ کر کے دعا مانگی اے اللہ میں تیری بارگاہ میں اپنے رنج و غم کا شکوہ پیش کرتی ہوں تو ہی اس کو دور فرمانے والا ہے اس پر یہ آیات نازل ہوئیں قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ الخ کہ اے ہمارے پیغمبر اللہ نے اس عورت کی بات سُن لی ہے۔ جو آپ سے جھگڑ رہی ہے اپنے خاوند کے معاملہ میں اور اللہ کی طرف وہ اپنی شکایت پیش کر رہی ہے تو ابتداءِ سورت میں ظہار کر لینے پر کفارہ اور کفارۂ ظہار کا حکم بیان فرمایا گیا۔"[26]

اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مسائل اور حقوق کے لیے ریاست کے سربراہ یا سب سے بڑی دینی اتھارٹی (رسول اللہ ﷺ) کے سامنے براہِ راست اپنا مقدمہ پیش کرے۔ خولہ بنتِ ثعلبہ رضی اللہ عنہا کا تکرار کرنا ظاہر کرتا ہے کہ دینِ اسلام میں مظلوم کی آواز دبائی نہیں جاتی۔ فقہ السیرہ کا ایک بڑا اصول اس واقعے سے یہ ملتا ہے کہ اسلامی ریاست کے سربراہ اور عام شہری کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کا براہِ راست نبی ﷺ کے پاس آنا اور اپنی شکایت پیش کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا تھا جہاں ایک کمزور خاتون بھی وقت کے حاکم سے سوال کر سکتی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ نہیں سنایا بلکہ اس وقت کے رواج (جاہلیت کے قانون) کے مطابق جواب دیا لیکن جب تک اللہ کا حکم نہیں آ گیا آپ ﷺ خاموش رہے۔ اس سے یہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ شرعی معاملات میں قطعی فیصلہ وحی اور نصِ قرآنی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ نبی ﷺ وحی کے بغیر معاملات میں انسانی عقل اور رائج معاشرتی قوانین کو مدنظر رکھتے تھے تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح نہ فرما دے۔ دوسری طرف "ظہار" جاہلیت میں طلاقِ مغلظہ سمجھا جاتا تھا جس کے بعد رجوع کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسلام نے اس سخت اور غیر فطری رسم کو ختم کیا اور اسے طلاق کی بجائے ایک گناہ قرار دے کر "کفارہ" کے ذریعے ازدواجی زندگی بچانے کی راہ نکالی۔ جب خولہ رضی اللہ عنہا کو بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں اپنا دکھ پیش کیا۔ قرآن نے "تشتکی الی اللہ" کے الفاظ استعمال کر کے یہ سکھایا کہ جب دنیا کے سارے دروازے بند نظر آئیں تو اللہ سے دعا کرنا مومن کا شیوہ ہے۔ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے سننے کی صفت کے لامحدود ہونے پر پختہ یقین دلاتا ہے۔ اسلام نے خاندان کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے "ظہار" جیسے سخت جملے پر کفارہ (روزے رکھنا، مسکینوں کو کھانا کھلانا یا غلام آزاد کرنا) لازم کیا تاکہ غصے میں کیے گئے فیصلوں سے گھر برباد نہ ہوں۔

قدیم اردو تفاسیر میں دعوتی و تعلیمی و سماجی پہلو

قدیم اردو تفاسیر میں اخلاقی اور فقہی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ دعوتی اور تعلیمی عناصر کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مفسرین نے قرآنی آیات کی روشنی میں تبلیغِ دین کے اصول، اسلوبِ دعوت اور تعلیم و تربیت کے مؤثر طریقوں کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس مطالعے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ مفسرین نے کس طرح ان آیات کے ذریعے معاشرے کی اصلاح اور علمی بیداری کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس سلسلے میں منتخب تفاسیر کا جائزہ درج ذیل ہے:

اوّل: تفسیر عثمانی از علامہ شبیر احمد عثمانی

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں منصبِ رسالت کی ذمہ داریوں اور دعوت و تبلیغ کے اہم تقاضوں کو نہایت مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ سورہ مائدہ کی اس آیت کے تحت انہوں نے پیغامِ حق پہنچانے میں کسی خوف و خطر کو خاطر میں نہ لانے اور دعوت کی اہمیت پر جو بصیرت افروز بحث کی ہے، اس کی ایک نمایاں مثال درج ذیل ہے: اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ[27]

اے رسول ﷺ پہنچادو وہ (پیغام) جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کا پیغام پہنچایا ہی نہیں اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا بے شک اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَّبِّک" میں اسی دوٹوک اعلان کے لئے حضور ﷺ کو تیار کیا گیا ہے۔ یعنی آپ پر جو کچھ پروردگار کی طرف سے اتارا جائے خصوصاً اس طرح کے فیصلہ کن اعلانات آپ بے خوف و خطر اور بلا تامل پہنچاتے رہیے۔ اگر بفرضِ محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول ہونے کے، رسالت و پیغام رسانی کا جو منصب جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے سمجھا جائے گا کہ آپ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا۔ بلاشبہ نبی کریم ﷺ کے حق میں فریضہ تبلیغ کی انجام دہی پر بیش از بیش ثابت قدم رکھنے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مؤثر عنوان نہ ہو سکتا تھا۔ آپ نے بیس بائیس سال تک جس بے نظیر اولوالعزمی، جانفشانی، مسلسل جدوجہد اور صبر واستقلال سے فرضِ رسالت و تبلیغ کو ادا کیا وہ اس کی واضح دلیل تھی کہ آپ کو دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر اپنے فرض منصبی (رسالت و بلاغ) کی اہمیت کا احساس ہے۔ نبی ﷺ کے اس احساسِ قوی اور تبلیغی جہاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وظیفۂ تبلیغ مزید استحکام و ثبات کی تاکید کے موقع پر مؤثر ترین عنوان یہ ہی ہو سکتا تھا کہ نبی ﷺ کو "يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ" سے خطاب کر کے صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ اگر بفرضِ محال تبلیغ میں ادنیٰ سی کوتاہی ہوئی تو سمجھو کہ آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کی تمام تر کوششوں اور قربانیوں کا مقصدِ وحید ہی یہ تھا کہ آپ خدا کے سامنے فرضِ رسالت کی انجام دہی میں اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل فرمائیں لہٰذا یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں بھی ذرا سی کوتاہی کریں۔"[28]

یہاں اللہ رب العزت نے صرف یہ نہیں کہا کہ بات بتادو بلکہ فرمایا "بَلِّغْ"۔ عربی میں تبلیغ کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو اس کی انتہا تک پہنچانا۔ یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ کی دعوت کا مقصد محض اطلاع دینا نہیں ہے بلکہ مخاطب پر اتمامِ حجت کرنا ہے۔ یعنی کہ وہ پیغام کو ہر فرد تک اس طرح پہنچانے کے پابند ہیں کہ کوئی عذر باقی نہ رہے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔ ایک معلم کے لیے اس حکم میں یہ نکتہ چھپا ہے کہ علم کی امانت کتنی بھاری ہے۔ اگر معلم نصاب کا ایک حصہ بھی چھپا لے تو وہ اپنی ذمہ داری میں ناکام ہے۔ یہ حکم نبی کے اس تعلیمی پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے معلم ہیں جو ذرہ برابر بھی علمی خیانت نہیں کر سکتے چاہے حالات کتنے ہی ناساز گار ہوں۔ دوسری طرف اللہ رب العزت نے فرمایا: اللہ آپ کو لوگوں

سے بچائے گا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کام کا حکم دیا جا رہا ہے وہ سماجی طور پر کتنا سنگین ہے۔ دوسرا یہ بھی کہ اب جو بات آپ ﷺ بتانے والے ہیں وہ لوگوں کی انا، ان کے سیاسی نظام یا ان کے سماجی ڈھانچے پر گراں گزرے گی۔ کیونکہ ہر دور میں معاشرے پر کچھ طاقتور لوگ قابض ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ایسی قیادت سامنے آئے جو لوگوں کو ذہنی یا سماجی طور پر آزاد کر دے یا کسی نئی قیادت کا اعلان کرے۔ جب اللہ نے کہا کہ میں بچاؤں گا تو اس کا مطلب تھا کہ اے نبی ﷺ آپ بلا جھجھک وہ اعلان کر دیں جس سے معاشرے کے بڑے بڑوں کے مفادات ٹکراتے ہیں۔ آپ کی جان کی حفاظت میری ذمہ داری ہے مگر آپ سماجی اصلاح اور قیادت کا وہ پیغام ضرور پہنچا دیں جو پورے معاشرے کی سمت بدل دے گا۔ ایک لیڈر کا کام صرف ہدایات دینا نہیں بلکہ لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی رہنمائی کرنا اور سماجی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے اللہ کے احکامات کو نافذ کرنا ہے۔

دوم: تفہیم القرآن از سید ابو الاعلیٰ مودودی

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے "تفہیم القرآن" میں قرآنی آیات کے دعوتی مقاصد اور مبلغ کے داخلی جذبات کو بہت اہمیت دی ہے۔ سورہ کہف کی اس آیت کے تحت انہوں نے نبی کریم ﷺ کی اپنی امت کے لیے تڑپ اور ان کے تعلیمی و تربیتی مشن کے حوالے سے جو وضاحت کی ہے، اس کی ایک نمایاں مثال درج ذیل ہے: اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا[29]

(محمد ﷺ) شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

> "یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اُس وقت نبی ﷺ مبتلا تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو رنج اُن تکلیفوں کا نہ تھا جو آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، بلکہ جو چیز آپ ﷺ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی وہ یہ تھی کہ آپ ﷺ اپنی قوم کو گمراہی اور اخلاقی پستی سے نکالنا چاہتے تھے اور وہ کسی طرح نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کو یقین تھا کہ اس گمراہی کا لازمی نتیجہ تباہی اور عذاب الٰہی ہے۔ آپ ﷺ ان کو اس سے بچانے کے لیے اپنے دن اور راتیں ایک کیے دے رہے تھے۔ مگر انھیں اصرار تھا کہ وہ خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہی رہیں گے۔ اس آیت میں بظاہر تو بات اتنی ہی فرمائی گئی ہے کہ شاید تم اپنی جان ان کے پیچھے کھو دو گے مگر اسی میں ایک لطیف انداز سے آپ ﷺ کو تسلی بھی دے دی گئی ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اس لیے تم کیوں اپنے آپ کو رنج و غم میں گھلائے دیتے ہو؟ تمھارا کام صرف بشارت اور اِنذار ہے، لوگوں کو مومن بنا دینا تمھارا کام نہیں ہے۔ لہٰذا تم بس اپنا فریضہ تبلیغ ادا کیے جاؤ۔ جو مان لے، اسے بشارت دے دو۔ جو نہ مانے، اسے بُرے انجام سے متنبہ کر دو۔"[30]

ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے صرف الفاظ کا استعمال نہ کرے بلکہ اس کے دل میں لوگوں کو جہنم سے بچانے کی سچی تڑپ ہو۔ جیسا کہ آپ ﷺ بار بار ان کے پاس جاتے تھے یہاں تک کہ ان کے انکار پر آپ ﷺ کو شدید دکھ ہوتا تھا۔ یہ ایک داعی کی استقامت کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسری طرف تعلیم و تربیت کے حوالے سے یہ آیت ایک عظیم سبق دیتی ہے کہ ایک معلم تبھی کامیاب ہوتا ہے جب وہ اپنے طالب علموں کی اصلاح کے لیے "شفیق باپ" کی طرح فکر مند ہو۔ معلم اور طالب علم کے درمیان صرف خشک معلومات کا تبادلہ نہیں بلکہ ایک قلبی تعلق ہونا چاہیے۔

یہ آیت انسانیت کی قدر و قیمت کو بھی ظاہر کر رہی ہے کیونکہ نبی ﷺ کا غم ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ معاشرے کی تباہی کو روکنے کے لیے تھا۔ یہ ایک لیڈر کا سماجی کردار ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو اخلاقی پستی سے نکالنے کے لیے بے چین رہے۔ مخالفین کے رویے کے جواب میں آپ ﷺ نے غصہ یا انتقام کی بجائے "غم اور فکر" کا اظہار کیا۔ یہ سماجی امن اور رواداری کی بہترین مثال ہے کہ آپ اپنے دشمن کے لیے بھی ہدایت کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب حق کی راہ میں کام کرنے والے مخلص لوگ نتائج نہ ملنے پر مایوسی یا شدید رنج کا شکار ہونے لگیں تو انہیں قرآن کے اس اسلوب سے تسلی دینی چاہیے کہ "آپ کا کام صرف بشارت اور انذار ہے۔" یہ داعی کی ذہنی صحت اور استقامت کے لیے ضروری ہے۔ دوسرا یہ کہ تبلیغ کا ایک اہم جز "بُرے انجام سے متنبہ کرنا" بھی ہے۔ محض نرم گفتگو ہی نہیں بلکہ گمراہی کے عذاب سے دوٹوک الفاظ میں آگاہ کرنا بھی سنتِ نبوی کا حصہ ہے۔

سوم: معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے اپنی اس تفسیر میں مفسرینِ سلف کے اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے دعوتی و تعلیمی نکات کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سورہ قصص کی اس آیت کے تحت انہوں نے دعوتِ دین کی اہمیت اور داعی کے لیے استقامت کے پہلو کو جس علمی انداز میں واضح کیا ہے، اس کی ایک نمایاں مثال درج ذیل ہے: اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ[31]

اور وہ تمہیں اللہ کی آیات سے نہ روکیں جب کہ وہ تم پر نازل ہو چکی ہیں۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دیتے رہو اور مشرکوں میں سے ہر گز نہ ہونا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

"اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دیتے ہیں کہ یہ نبوت اور رسالت اور نزولِ قرآن سب اللہ کی رحمت ہے جو آپ کو بلا کسی امید اور بلا کسی توقع کے عطا کی گئی ہے لہذا آپ ﷺ اس کی تبلیغ اور دعوت میں لگے رہیے اور کافروں کی مخالفت اور عداوت کی پرواہ نہ کیجیے۔"[32]

معلوم ہوا کہ نبوت کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے۔ مکہ میں نبوت سے قبل آپ ﷺ کی زندگی زہد و عبادت میں تو گزری لیکن آپ ﷺ نے کبھی منصبِ نبوت کی طلب یا منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ یہ آیت دعوتِ دین کے لیے ایک بنیادی گائیڈ لائن فراہم کرتی ہے کہ داعی کو اپنے مشن میں اتنا پختہ ہونا چاہیے کہ مخالفین کی رکاوٹیں یا پروپیگنڈا اسے مشن سے نہ روک سکے۔ دعوت کا اصل مرکز صرف اللہ کی ذات ہونی چاہیے "وادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ" یعنی ذاتی شہرت یا گروہ بندی کی بجائے صرف رب کی طرف بلانا۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں دعوت کا کام رکنا نہیں چاہیے۔ دوسرا یہ کہ جب اللہ کی طرف سے کوئی ذمہ داری مل جائے تو نتائج کی پرواہ کیے بغیر اس پر جم جانا واجب ہے۔ یہ داعی کے لیے استقامت کا درس ہے تعلیم کا اصل ماخذ وحی اور اللہ کی آیات ہیں۔ جب وحی آ جائے تو پھر اس پر عمل اور اس کی ترویج میں کسی سمجھوتے کی گنجائش نہیں۔ دوسری طرف ایک معلم کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ معاشرتی دباؤ میں آکر حق کو نہ چھپائے۔ تعلیم کا مقصد معاشرے کی اصلاح ہو نہ کہ معاشرے کے غلط نظریات کے سامنے جھک جانا۔ آیت کے آخر میں "وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" کا ذکر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ داعی خود کو کسی ایسے مخصوص طبقے یا گروہ کا حصہ نہ بنائے جو حق کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ ایک سماجی مصلح کو غیر جانبدار اور صرف حق کا علمبردار ہونا چاہیے تاکہ معاشرے کا ہر طبقہ اس کی بات سن سکے۔

قدیم اردو تفاسیر میں فقہ السیرۃ کے اثرات

قدیم اردو تفاسیر میں فقہ السیرہ کے اثرات نہایت گہرے، متنوع اور عملی نوعیت کے ہیں۔ ان چند مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف تفاسیر میں فقہ السیرہ کی اہمیت موجود ہے۔ مفسرین نے فقہ السیرہ کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اس کے فقہی و عملی پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ قدیم اردو تفاسیر میں فقہ السیرۃ کے اثرات نے قرآن کی تشریح کو محض نظری بحث تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی سے جوڑ کر ایک جامع اور قابلِ عمل منہج بنایا جس کے ذریعے فرد، معاشرہ اور ریاست کے لیے اخلاقی، دعوتی، فقہی اور اجتماعی اصول واضح ہوئے اور سیرت قرآن فہمی، شرعی استنباط اور امت کی عملی تربیت کا بنیادی ماخذ بن کر سامنے آئی۔

حاصلِ بحث

تحقیق کے تمام مراحل اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں سیرتِ نبوی ﷺ کا بیان محض واقعات کا مجموعہ نہیں، بلکہ نبوی زندگی کے اہم فکری اور عملی پہلوؤں کو واضح کرنے والا مربوط بیان ہے۔ آیات کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ قرآن نے ایمان و عبادت کے ساتھ اخلاق، دعوت، صبر و استقامت، معاشرتی تعلقات، عدل، انسانی برتاؤ اور اجتماعی ذمہ داری جیسے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ یوں سیرت کے قرآنی بیان میں فرد کی اصلاح کے ساتھ اس کے عملی اور معاشرتی کردار کی رہنمائی بھی موجود ہے۔ فقہ السیرۃ کے تناظر میں سیرت کے واقعات دیکھنے پر یہ حقیقت سامنے آئی کہ سیرت کے واقعات کی اصل اہمیت صرف ان کے جان لینے میں نہیں، بلکہ ان سے اصول، حکمت اور عملی رہنمائی اخذ کرنے میں ہے۔ قرآن میں بیان ہونے والے نبوی واقعات اسی وقت اپنی پوری معنویت کے ساتھ سامنے آتے ہیں جب انہیں ان کے مقصد اور حالات کے ساتھ سمجھا جائے۔ اس مطالعے سے یہ بھی واضح ہوا کہ فقہ السیرۃ سیرت کے فکری، اخلاقی، روحانی، فقہی، معاشرتی اور تربیتی پہلوؤں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔

قدیم اردو تفاسیر کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اردو مفسرین نے آیاتِ سیرت کی تشریح محض واقعات کے بیان تک محدود نہیں رکھی۔ انہوں نے شانِ نزول، سیرتی پس منظر اور قرآنی ہدایات کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے اخلاقی، روحانی، فقہی، معاشرتی اور تربیتی نکات بھی اخذ کیے۔ اس طرح تفسیری مطالعے نے ان قرآنی واقعات کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جو براہِ راست انسانی کردار اور عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالخصوص یہ بات سامنے آئی کہ ایک ہی قرآنی واقعہ سے مفسرین نے مختلف مواقع پر حکم، اخلاق، تربیت، معاشرت اور اصلاح کے متعدد پہلو واضح کیے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ علمی مطالعہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ قرآن سیرتِ نبوی ﷺ کے واقعات کو صرف محفوظ نہیں کرتا بلکہ ان کے اندر موجود رہنمائی کو نمایاں کرتا ہے، اور اردو تفاسیر اس رہنمائی کو مزید کھول کر سامنے لاتی ہیں۔ قرآن کے سیرتی بیان اور اردو تفسیری تعبیرات کو فقہ السیرۃ کے زاویے ساتھ رکھنے سے سیرت کے واقعات کے پیچھے موجود حکمتیں، ان سے نکلنے والے اصول اور زندگی سے متعلق ان کی عملی معنویت زیادہ واضح ہوتی ہے۔ اس طرح سیرتِ نبوی ﷺ کا مطالعہ محض یہ جاننے تک محدود نہیں رہتا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا کیا، بلکہ یہ سمجھنے تک پہنچتا ہے کہ آپ ﷺ کے اسوہ سے ہم کیا سیکھ سکتے ہیں اور اسے اپنی زندگی میں کہاں اور کیسے برت سکتے ہیں۔

تجاویز و سفارشات

- جامعات اور دینی مدارس کے نصاب میں "فقہ السیرہ اور اردو تفسیری ادبیات" کو ایک مستقل اور عملی مضمون کے طور پر شامل کیا جائے، تاکہ طلبہ قرآنی احکام اور سیرت کے تطبیقی پہلوؤں کو علمی تناظر میں سمجھ سکیں۔

- عصرِ حاضر کے محققین اور مفسرین کو چاہیے کہ وہ قدیم اردو تفاسیر کے فکری وفقیہانہ اسلوب کا جدید اجتماعی اور دعوتی مسائل کی روشنی میں مطالعہ کریں، تاکہ دورِ حاضر کے چیلنجز کا متوازن اور عملی حل سامنے آسکے۔
- آئمہ، خطباء اور دینی معلّمین اپنے خطبات اور درس و تدریس میں سیرتِ نبوی ﷺ کے محض واقعاتی پہلوؤں تک محدود رہنے کی بجائے ان کے فقیہانہ، اخلاقی اور انتظامی حکمتوں کو اجاگر کریں، تاکہ معاشرے میں عملی دین داری کا شعور عام ہو۔
- علمی و تحقیقی مراکز کو چاہیے کہ وہ سیرتِ طیبہ اور تفسیری ادبیات پر ہونے والی معیاری تحقیقات کو جدید ذرائعِ ابلاغ اور بین الاقوامی زبانوں میں منتقل کریں، تاکہ اسلام کے عالمگیر اور آفاقی اصول دنیا کے سامنے واضح ہو سکیں۔

\-

References

1 Ibn al-Athīr, *Al-Nihāyah fī Gharīb al-Ḥadīth*, ed. Ṭāhir Aḥmad al-Zāwī (Qum, Iran: Mu’assasāt Ismā‘īlīyān, 4th ed., 1364 AH),3:465.

2 Al-Shahīd al-Awwal, *Dhikrā al-Shī‘ah fī Aḥkām al-Sharī‘ah* (Qum, Iran: Mu’assasāt Āl al-Bayt 'alayhim al-salām li-Iḥyā' al-Turāth, 1419 AH), 1:40.

3 Bāṣamad, Iqbāl Muḥammad. *Muqarrar: Fiqh al-Sīrah al-Nabawīyah* (Makkah al-Mukarramah: Jāmi‘at Umm al-Qurā, Kullīyat al-Da‘wah wa Uṣūl al-Dīn, n.d.), 4.

4 Ibid.

5 Ibid.

6 Al-Qur’ān 8:45.

7 Al-Qur’ān 3:152.

8 Al-Qur’ān 4:83.

9 Al-Qur’ān 17:70.

10 Al-Qur’ān 16:106.

11 Al-Qur’ān 59:5.

12 Al-Qur’ān 80:1–2.

13 Al-Qur’ān 12:108.

14 Al-Qur’ān 61:2–3.

15 Uthmānī, Shabīr Aḥmad, *Tafsīr-i ‘Uthmānī* (Karāchī: Dār al-Ishā‘at, Aṭhar Press, 1428 AH), 3:683.

16 Al-Qur’ān 39:11.

17 Mawdūdī, Abū al-A‘lā. *Tafhīm al-Qur’ān* (Lahore: Idārah Tarjumān al-Qur’ān, 1368 AH), 4:364.

18 Al-Qur’ān 66:1.

19 Kāndhlawī, Muḥammad Idris, *Ma‘ārif al-Qur’ān* (Karāchī: Al-Qādir Printing Press, 1422 AH), 8:165.

20 Al-Qur’ān 24:2.

21 Uthmānī, *Tafsīr-i ‘Uthmānī*, 2:665.

22 Al-Qur’ān 33:37.

23 Mawdūdī, *Tafhīm al-Qur’ān*, 4:100.

24 Ibid, 4:101.

25 Al-Qur’ān 58:1.

26 Kāndhlawī, *Ma‘ārif al-Qur’ān,* 8:2.

27 Al-Qur’ān 5:67.

28 Uthmānī, *Tafsīr-i ‘Uthmānī*, 1:553.

29 Al-Qur’ān 18:6.

30 Mawdūdī, *Tafhīm al-Qur’ān*, 3:10.

31 Al-Qur’ān 28:87.

32 Kāndhlawī, *Ma‘ārif al-Qur’ān*, 6:79.